R. N. 2186/57 — Regd. No. A 962

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 39

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپے
ایک پرچہ
دس نئے پیسے

جلد ۲۱ ۔ شمارہ ۱	ایڈیٹر ۔ آل احمد سرور	علی گڑھ ۔ یکم جنوری ۱۹۶۲ء

اہم ادبی رسالے ۔ ۵

بابائے اردو کا رسالہ افسر

عابد رضا بیدار

حیدر آباد پہنچ کر علی گڑھ کے گریجویٹ عبدالحق نے "عالی جناب نواب میجر افسر الدولہ بہادر کی سرپرستی" میں ۱۸۹۵ء میں افسر کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا۔ جو کم سے کم ۱۸۹۶ء کے وسط تک ضرور جاری تھا۔

قواعد و ضوابط کی رو سے اس رسالے کا مقصد "ہر قسم کے علمی، اخلاقی، تاریخی، فلسفی اور تمدنی و قومی مضامین ۔ اور عمدہ کتابوں پر ریویو" شائع کرنا تھا۔ "ہر ماہ سب سے عمدہ مضمون کے لئے ایک اشرفی نذر" مقرر تھی ۔ رسالہ ۶۴ صفحات پر مشتمل تھا۔

مجھے پانچویں جلد کے دو پرچے ملے ہیں نمبر ۵ اور نمبر ۶ یعنی مئی اور جون ۱۸۹۶ء کے شمارے ۔ ان ہی پرچوں سے یہ بات متعین کی ہے کہ افسر کی پہلی جلد ۱۸۹۵ء کی جنوری میں شروع ہوئی ہوگی۔

مئی نمبر میں سب سے پہلے "مسئلہ ازدواج پر ایک نظر" کے عنوان سے مولوی محمد اختر کا مضمون ہے جس میں بن دیکھے اور مزاج کی ہم آہنگی کے بغیر شادی کو غیر مناسب اور غیر اسلامی بتایا ہے ۔ دوسرا مضمون، "عورتوں کی نسبت سر سید احمد خاں کے خیالات" مولوی محب حسین نے لکھا ہے ۔ یہ اس مضمون کی دوسری قسط ہے اور اس کا ذیلی عنوان "خواب سرا" ہے ۔ تیسرا مضمون مولوی علی شبیر نے عراق کے صابئین پر لکھا ہے اس کا عنوان ہے: "ایک ستارہ پرست قوم"۔ آخری مضمون حالی کی حیات جاوید پر تفصیلی ریویو ہے ۔ یہ ایڈیٹر کے قلم سے ہے اور عبارت کی سادگی اور پرکاری کے لحاظ سے آج بھی خاصے کی چیز ہے ۔ یہ مضمون حیات جاوید کے تبصرہ کی حیثیت سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ جس طرح اس کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ آج کی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ یہ مضمون میں یہاں درج کر رہا ہوں ۔ اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا ۔ عنوان ہے "اردو لٹریچر کی سب سے اعلیٰ کتاب" مولوی صاحب کا یہ مضمون شاید ان کے کسی مجموعہ میں ابھی تک نہیں آسکا ہے۔

دوسرے پرچے میں پروفیسر ولی ہٹ سنگ کا انگریزی مضمون ہے اور اس کے ساتھ ولی ہٹ سنگ کا تذکرہ بھی ہے ۔ یہ تذکرہ "چند ہم عصر" میں آچکا ہے ۔ اس وقت کے ترجمہ کرنے کا انداز معلوم کرنے کے لئے ولی ہٹ سنگ کے طویل مضمون کے اس ترجمہ کی بھی بڑی اہمیت ہے ۔ اس کے بعد ایڈیٹر ہی کے دو مضمون ہیں ایک "مصنفین کی نسبت غائبانہ خیال" اور دوسرا نظیر حسین فاروقی کی کتاب سیرت رسول کا ریویو ۔ ریویو میں کوئی خاص بات نہیں ہے "مصنفین کی نسبت غائبانہ خیال" دلچسپ مضمون ہے میں اسے بھی یہاں نقل کرتا ہوں ۔ بابائے اردو کی یہ دونوں یادگاریں امید ہے، دلچسپی سے پڑھی جائیں گی ۔ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس وقت سے اب تک مولوی صاحب کے اسلوب میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ۔ ہاں جذبہ کی شدت اور بیان کی شگفتگی اس وقت نسبتاً زیادہ ہے جس کی جگہ ٹھہراؤ اور سنجیدگی نے لے لی۔

ایک بات اور ۔ چند ہم عصر میں، ولی ہٹ سنگ کے علاوہ افسر میں چھپے ہوئے دو اور مضمون آگئے ہیں ۔ ایک مرزا حیرت پر ہے جسے مولوی صاحب مرحوم نے اپنا مضمون نہیں مانا ہے، اور دوسرا امیر مینائی پر جسے مولوی صاحب نے سرسری مضمون کہہ کر رد کر دیا ہے پہلے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا کہ کس خاص مہینے رسالہ میں چھپا امیر مینائی والا مضمون امیر کے انتقال پر لکھا گیا ہے اور اس کے ۱۹۰۱ء کے کسی پرچے سے لیا گیا ہے۔

(1)

اُردو لٹریچر کی سب سے اعلیٰ کتاب

اگر کسی قوم کے لٹریچر کو، بلکہ کہ اس قوم کی دماغی ترقی اور تنزل کا اندازہ ہو سکتا ہے تو ہمیں اس کتاب حیاتِ جاوید کے دیکھنے سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے اور ہم سب کے لئے نہایت مسرت کا باعث ہے کہ ہم میں ابھی کم سے کم ایک ایسا عالی دماغ شخص موجود ہے جس کی محنت و غور و فکر کا نتیجہ ایک ایسی لاجواب کتاب ہے جس کی نظیر نہ صرف اُردو زبان میں بلکہ فارسی اور شاید عربی میں بھی نہیں مل سکتی۔ سرسید کا نام ہندوستان کے مسلمانوں میں ہمیشہ عزت کے ساتھ یادگار رہے گا۔ اس کا نام اسکے کام کی طرح کبھی مٹنے والا نہیں۔ لیکن سرسید کے ہمسر نہیں تو دوسرے درجہ پر جس شخص کا نام زبان زد خاص و عام ہوگا وہ حالی ہے۔ سرسید نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے زیادہ موثر بنانے اور ان خیالات کو زیادہ حسن و خوبی کے ساتھ اشاعت کرنے میں حالی نے سحر کا کام کیا ہے لیکن اس کتاب کے لکھنے سے یہ دونوں اور بھی قریب تر ہو گئے ہیں۔ اب ان کا نام ایک ساتھ آئے گا اور انکی حیات درحقیقت حیات جاوید ہے۔ قطع نظر دیگر احسانات کے، ان دو حضرات نے ایک بڑا احسان اردو ادب پر کیا ہے جس سے ہم کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ گو اس میں شک نہیں کہ سرسید کا نام اور کام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور سب سے زیادہ یاد رہے گا۔ لیکن حالی کی تصانیف سرسید کی تصانیف سے زیادہ پڑھی جائیں گی اور شاید سب سے زیادہ یہ کتاب حیاتِ جاوید پڑھی جائے گی، نہ یا اس لئے کہ اس میں سرسید کا ذکر ہے یا اس لئے کہ یہ مولانا حالی کی تصنیف ہے۔ نہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ دونوں باتیں ایک جا ہو گئی ہیں، اور اس کتاب نے دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ ایک اگر آواز ہے تو دوسرا گونج ہے۔ اور ظاہر ہے کہ گونج زیادہ دلفریب اور خوشنما ہوتی ہے۔ ہمارے بعض قابل احباب جو ناگری والوں کے شور و غوغا سے گھبرا اُٹھے تھے اور بعض اب تک بدحواس ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ اُردو کی حیثیت ایسی نہیں کہ چند بے تکوں کی ہانک سے، یا دفتر کے رجسٹروں کی خانہ بدری سے اسے مٹ جانے کا خوف ہو۔ اور اگر پیشتر یہ حقیقت نہ تھی تو اب اس کتاب نے اردو زبان کا پایہ اور بلند کر دیا ہے اور اب وہ لومڑیوں کی دستبرد سے بالکل محفوظ ہے۔

مولانا حالی نے اس کتاب کے دو حصے کئے ہیں۔ پہلے حصہ میں سرسید کے حالات ہیں اور دوسرا حصہ جو بہت بڑا ہے اس میں سرسید کے کارناموں کا ذکر ہے۔ بہت سی باتیں جو اب تک لوگوں تک نہیں پہنچیں، اس میں نظر آئیں گی۔ اور بہت سی باتیں جو شاید بھول بسر جاتیں اس میں محفوظ ہیں ــــ اور جو ہمارے اعمال گزشتہ کی ایک تصویر ہے۔ یہ کتاب درحقیقت مسلمانوں اور خصوصاً شمال ہند کے مسلمانوں کی گزشتہ پچاس سال کی رفتار کی ایک فلسفیانہ تاریخ ہے۔ وہ نوجوان جنھوں نے وہ وقت نہیں دیکھا اور ایسے زمانہ کی ہوا کھائی ہے جبکہ اس نامور بہادر شخص نے جہالت اور تعصب کے پرخار اور ڈراؤنے جنگل کو اپنی جانفزا کوششوں اور مسرت انگیز جانکاہیوں سے صاف و پاک کر دیا ہے اس کتاب کے دیکھنے سے انھیں معلوم ہوگا کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے اور وہ صرف ایک شخص کی بدولت۔ وہ طرح طرح سے قوم کی بھلائی چاہتا تھا اور قوم اس کی مخالفت پر آمادہ تھی۔ وہ انھیں ہلاکت سے بچانا چاہتا تھا اور قوم اس کے ہلاک کرنے کی فکر میں تھی۔ اس پر ہر طرف سے لعنت ملامت اور گالیوں کی بوچھاڑ پڑتی تھی۔ مگر وہ چپکا سُنا کیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے ہزاروں جسمانی و روحانی اور مالی تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ مگر اس سخت دل و متعصب اور جھگڑتی ہوئی قوم کو راہ پر لا کے چھوڑا۔ اور گو یاروں نے بہت کچھ شور و غل مچایا اور خاک اڑائی۔ مگر آخر مان گئے۔ اور مان کیا گئے اس کی راستبازی، خلوص اور اعلیٰ قابلیت اور بے ریا کوششوں نے خود منوا دیا۔ یہ بڑی کٹھن منزل ہے۔ اس میں بڑے بڑے سورما اور جواں مرد رہ گئے اور جو اس امتحان میں پورا اترا سمجھو کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔ اور جس قوم میں وہ پیدا ہوا ہے سمجھو کہ اس پر خدا کی رحمت ہے۔ اور اسکے دن پھر چلے ہیں۔

سرسید میں اس قدر مختلف صفات اور مختلف قابلیتیں جمع تھیں کہ ان کی لائف کا لکھنا ہر ایک کا کام نہ تھا اور اس کتاب کے پڑھنے سے ہمیں اور بھی وثوق ہو گیا ہے کہ سوائے مولانا حالی کے کوئی دوسرا اس کار اہم سے عہدہ برآ نہ ہو سکتا۔ بلکہ ہمارا یہاں تک یقین ہے کہ اگر سرسید کی لائف کا ایک ایک حصہ ہر ایک ایسے شخص کو لکھنے کے لئے دیا جاتا جو اس فن میں ممتاز اور مسلم ہے تو بھی یہ کام اس خوبی سے سرانجام نہ پاتا۔ کیونکہ ہم اس کا نمونہ ایم اے۔ او۔ کالج میگزین میں دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ مضمون بہت مختصر لکھے گئے تھے اور مولانا حالی نے بھی حتی الامکان اختصار مدنظر رکھا ہے۔ لیکن جب ہم ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ہر مضمون کا اٹھان اور اس کا نبھاؤ جس خوبی اور حسن کے ساتھ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ کہیں ہندوستان کی قدیم سوسائٹی اور مغلیہ خاندان کی زوال پذیر حالت کا بیان، کہیں غدر کا تیرہ و تاریک زمانہ اور سرسید کی جواں مردی اور وفاداری کے حالات، کہیں مسلمانوں کی تمدن کی اصلاح کے متعلق سرسید کے خیالات اور کوششیں، کہیں مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات پر بحث، کہیں مسلمانوں کی حمایت میں سرسید کے مساعی جمیلہ اور انگریزوں کی بدگمانی کا رفع کرنا اور تحقیق مذاہب پر مدلل بحث، کہیں قرآنی تفاسیر، اسلامی عقائد اور اصول، روایات اور قیاس پر محققانہ گفتگو، کہیں ہندوستان کی موجودہ پالیٹکس اور سرسید کے کارہائے نمایاں اور کہیں اُردو لٹریچر اور مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ تعلیم پر گہری نظر اور اس کے متعلق سرسید کی سب سے بڑی کوشش اور احسان عظیم کا ذکر۔ غرض ہر مضمون اور ہر پہلو پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ اس سے بہت سی دلچسپ اور نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۰ پر)

اداریہ

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

ہماری زبان کے پڑھنے والوں کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم سال ۱۹۶۱ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالیں، اور نئے سال کے امکانات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

اُردو دنیا کے لئے یہ سال مسرت اور بصیرت کے بہت سے پہلو اور عبرت کے بہت سے مقامات لے کر آیا۔ فروری سنہ ۶۱ء میں انجمن کی آل انڈیا کانفرنس ہوئی جس کے اثر سے اُتر پردیش میں اردو تحریک کو مدد ملی۔ اُتر پردیش کی حکومت نے اُردو کے سلسلے میں اپنے احکام کی پابندی پر زور دیا۔ جنوبی منطقے کی کونسل نے جنوبی ریاستوں میں اُردو کے حقوق کو تسلیم کیا، اُردو کمیٹی اتر پردیش نے ایک اچھا سوالنامہ جاری کیا اور گواہوں کے بیان لینے شروع کئے۔ آزادی کے بعد اُردو اخبارات و رسائل کی ایک شاندار نمائش دہلی میں ہوئی۔ اُردو کے اخبارات کی تعداد میں سنہ ۱۹۶۰ء میں اضافہ ہوا اور ہندی کے بعد ہندوستانی زبانوں میں اُردو کا نمبر بدستور رہا۔ آندھرا پردیش میں ایک شاندار کانفرنس ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر تارا چند نے کی۔ بہار کی ریاستی شاخ نے بڑی زندگی کا ثبوت دیا اور بہار میں اُردو کے حقوق کو منوانے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی۔ اب وہاں کی یونیورسٹی میں اُردو کو بدستور امتحان کا ذریعہ رکھنے کے لئے مہم چلا رہی ہے۔ راجستھان کی ریاستی شاخ نے مقامی افسروں کی بے نیازی اور بے پروائی کو توجہ اور ہمدردی میں بدلا، پنجاب کی شاخ نے پنجاب میں اُردو کے حقوق منوانے پر اصرار کیا۔ دہلی کی شاخ نے جدید اردو ادیبوں کے منتخب افکار کا انگریزی میں ترجمہ تیار کیا جو اب طباعت کے مرحلوں سے گزر رہا ہے اور ایک رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا۔ کئی شاخوں نے ٹیگور کو خراج تحسین پیش کر کے اُنکے ہندوستانی اور عالمی اعتراف میں مدد دی۔ اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اُردو کے ساتھ انصاف کا جذبہ بڑھا، اُردو کی قومی حیثیت کا اعتراف زیادہ بڑے پیمانے پر ہونے لگا، اُردو دوستوں کے جائز مطالبات کو تسلیم کرنے کا امکان پیدا ہوا۔ ان سب باتوں پر ہم مسرت کا اظہار کر سکتے ہیں اور ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔

لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے جسے ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اُردو تحریک بعض علاقوں میں بڑی جاندار ہے، مگر مجموعی طور پر اس کی رفتار سست ہو گئی ہے۔ اس سستی کی ذمہ داری مرکزی انجمن پر بھی ہے اور ہمیں اس کوتاہی کا صدق دل سے اعتراف ہے، مگر صرف مرکز پر یہ ذمہ داری ڈال کر مطمئن ہو جانا صحیح نہ ہوگا۔ مرکز کے وسائل محدود ہیں، اُن کے پاس صرف ایک دفاتری حربہ ہے۔ کچھ لوگ خلوص سے لیکن حقائق کا جائزہ لئے بغیر یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو تحریک اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ہمارا احتجاج وہ صورت اختیار کرے جو اکالیوں نے اپنائی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ کانگریس اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے اس لئے مخالف پارٹیوں سے ناتہ جوڑنا چاہیئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ صرف ابتدائی تعلیم پر زور دینا چاہیئے۔ کچھ لوگ صرف مشاعروں اور ادبی کاموں کے فروغ میں نجات دیکھتے ہیں، کچھ ووٹروں کی فہرستیں اُردو میں تیار ہونے اور عدالتوں میں اُردو میں درخواستیں لے جانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ اُردو کے اخبار بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہیں تو خیریت ہے۔ ان میں سے ہر چیز مفید ہے مگر کوئی ایک چیز واحد ذریعہ نہیں ہے۔ یہ سب ذرائع مل کر اُردو کی بقا اور ترقی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ان معاملات میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی بساط کے مطابق کام کا میدان طے کرنا چاہیئے اور اس پر پوری توجہ کرنا چاہیئے۔

ہاں ایک چیز بہت ضروری ہے جس کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا، وہ ہے اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے نصب العین پر اعتماد۔ صرف اردو ہی ہندوستان کی زبان نہیں ہے اور بھی زبانیں ہیں، ہم سب کی ترقی چاہتے ہیں اور مجموعی طور پر قومی زبانوں کے فروغ میں اُردو کا فروغ دیکھتے ہیں اور اُردو کے فروغ سے قومی زبانوں کے فروغ تک پہنچتے ہیں۔ بلاشبہ دوسری زبانوں کی ترقی پر زیادہ توجہ ہوئی ہے، اردو کی ترقی پر کم۔ یہ ملک کی بدقسمتی ہے اور اس کے کچھ تاریخی وجوہ ہیں، مگر ہم یہ ماننے کو کبھی تیار نہیں ہیں کہ اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اردو کا مستقبل اس لئے روشن ہے کہ باوجود تنگ نظری اور تعصب کی آندھیوں کے قومیت، جمہوریت، سماجی توازن، مشترک تہذیب کی شمع روشن ہے اور سماج دشمن اور غیر جمہوری عناصر کی کوششوں کے باوجود صحت مند عناصر طاقت پکڑتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ملک و قوم کی منزل مقصود صحیح ہے اور اس کی طرف ہم گامزن بھی ہو رہے ہیں، مگر ابھی راہ میں بہت سے کانٹے ہیں اور پیچھے سے برابر آوازیں آ رہی ہیں۔ ہمیں راہ کے ان کانٹوں کو دور کرنا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش کا مقابلہ کرنا ہے۔ راہ کے کانٹے ہمیں اتنا زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم سفر ہی ترک کر دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہم پتھر کے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں تو ہر حال میں آگے بڑھتے رہنا ہے قومی شعور کو اتنا بیدار کرنا ہے کہ یہ ہمارے رگ و پے میں جاری و ساری ہو جائے، جمہوریت کی روح کو اپنانا ہے، مشترک تہذیب کی محبت کو عام کرنا ہے، ایک زبان سے انصاف کو سب کے ساتھ انصاف کا ذریعہ منوانا ہے۔ ہمارا کام تو اب شروع ہوا ہے۔ ہم اسے پیمانۂ "امروز و فردا" سے نہیں ناپ سکتے۔ نہ چند کامیابیوں سے خوش ہو سکتے ہیں نہ چند مشکلات یا دشواریوں سے بددل ہو سکتے ہیں۔ ہر سال ہمارے لئے نیا ولولہ، نیا عزم، نئے عہد و پیمان لاتا ہے۔ ہم اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں مگر اپنے خلوص اور ولولے پر اعتماد بھی رکھتے ہیں اور اس لئے

آگے بڑھنے اور منزلِ مقصود کو پالینے کے لئے اپنے آپ سے اور اپنے ساتھیوں سے پھر عہد کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ فروری کے عام چناؤ میں ہندوستان میں صحت مند عناصر کو کامیابی ہوگی اور قومی اور جمہوری قوتیں تازہ دم ہو کر ہندوستان کے قومی سرمائے خصوصاً قومی زبانوں کی ترقی کے لئے سربکف ہوں گی۔

اِدھر اُدھر سے

تلگو اور کنڑی کی مشترکہ ترقی کے لئے اقدامات

حیدرآباد۔ ۲۲ر دسمبر۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی مجلس عاملہ کا جلسہ دفتر اکیڈمی واقع تلک روڈ پر ۱۹ر دسمبر کو ڈاکٹر بی گوپال ریڈی وزیر تعمیرات اکنڈ و رسد حکومت ہند کی صدارت میں ہوا۔ شریمتی کامیشوری دیوی کو سری ماتھلی سرن گپتا کی کتاب "ہندی کسان" کا ترجمہ شائع کرنے کے لئے (۳۰۰) روپے کی امداد منظور کی گئی۔

مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ تلگو بولنے والے عوام کو دوسری زبانوں کے ادب سے قریب تر کرنے کی کوشش کو موثر پیمانہ پر جاری رکھنا چاہئے۔ اس ضمن میں تلگو سے کنڑی اور کنڑی سے تلگو سیکھنے کی کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

طے کیا گیا کہ مشہور شاعر گرا جیڈ کی صد سالہ تقاریب ستمبر ۱۹۶۲ء میں منائی جائیں۔ تیلگو ساوُنیر کی ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔ اس ساوُنیر کی اشاعت ۳ر جنوری کو بنگال کی کونسل کے صدر ڈاکٹر سنیت کمار چٹرجی کے ہاتھوں عمل میں آئے گی۔ حسب ذیل کتابوں کی طباعت و اشاعت کے انتظام کی منظوری دی گئی۔

(۱) قدیم تاریخی جغرافیہ آندھرا پردیش مولفہ شری کے ایشورودت (بزبان تلگی) (۲) سی پی براؤن کی سوانح حیات ڈاکٹر کے وی جلد اول اس کے علاوہ دیگر کتابوں کے لئے بھی امداد دی گئی۔ سری ورے سوامی شرما اور شری سمپت کمرا چاریہ کو ایک ہزار روپے کی مالی امداد منظور کی گئی تاکہ وہ اپنی کتابیں آندھرا یا ساتوں چھند و رتیلو شائع کر سکیں۔ تلگو ادب کے لئے سری ملوری گنگا دھرم نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر بورڈ نے ہمدردی سے غور کیا اور ان کے لئے مالی امداد (۱۰۰۰) روپے منظور کی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ حکومت آندھرا پردیش کو اس مصنف کی امداد کیلئے لکھا جائے تاکہ ماہانہ وظیفہ جاری ہو سکے۔

ویٹ نام کے ناول نویس کو فرنچ اکیڈمی کا انعام

فرنچ اکیڈمی کا گرانڈ پرائز ویٹ نام کے ناول نویس فام وان کی کو دیا گیا ہے۔ یہ انعام ان کی ایک ایسی ناول پر دیا گیا ہے جو شکستہ ہوکے جاپان سے متعلق ہے۔ فام وان کی ۱۹۴۰ء میں فرانس آئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ جنگ کے بعد انھوں نے فرنچ ریڈیو میں بھی کام کیا۔

یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ کے عہدیداروں کا انتخاب

یادگار انیس کمیٹی کے دو جلسے ۱۰ر اور ۱۴ر دسمبر کو کمیٹی کے صدر دفتر پر منعقد ہوئے۔ پہلے جلسے میں جو جناب اختر علی تلہری صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا کمیٹی کا دستور العمل منظور کیا گیا۔ دوسرا جلسہ پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں کمیٹی کے مندرجہ عہدیداران اور پانچ اراکین مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ صدر جناب سید علی ظہیر نائب صدر۔ پنڈت آنند نرائن ملا۔ سید صدیق حسن۔ مہاراجکمار محمد امیر خاں آف محمود آباد جنرل سکریٹری۔ مسٹر سید علی عباس حسینی جوائنٹ سکریٹری۔ مسٹر مرزا رضا حسین۔ اراکین عاملہ میں سید مظفر حسین طاہر زیدی سید شبیہ الحسن۔ حیات اللہ انصاری۔ بشیشور پرشاد منور اور نواب مہدی علی خاں شامل ہیں۔ چونکہ مقبرہ میر انیس کے مزار کی تعمیر کا کام جاری ہے کمیٹی نے معتقدین سے اس کار خیر میں اعانت کی اپیل کی ہے۔

آئندہ سال پنجاب میں ہندی اور پنجابی میں کام ہونے لگے گا

پٹیالہ۔ ۱۳ر دسمبر۔ معلوم ہوا ہے کہ آئندہ اکتوبر کے مہینہ سے پنجاب کے ۵۰ ہزار سرکاری ملازموں کو علاقائی زبانوں میں کام کرنا ہوگا۔ موجودہ حالات میں انگریزی اور اردو سے کام لیا جا رہا ہے۔

محکمۂ لسانیات کے ڈائرکٹر سردار لال سنگھ نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں ضلعوں کی سطح پر جو افسر اور سرکاری ملازم کام کرتے ہیں ان میں ۲۵ فی صدی ان علاقائی زبانوں سے واقف ہیں۔ ضلعوں کے ہیڈکوارٹروں میں اگلے سال جنوری کے مہینے سے پنجابی اور ہندی کی ٹائپ کی ٹریننگ کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ۱۸ مرکز قائم کر دئے گئے ہیں جن کے لئے ٹائپ کی ۲۰۰ جدید قسم کی مشینیں مہیا کی گئی ہیں۔ سرکاری ملازم ڈیوٹی کے وقت ان کلاسوں میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ کی تربیت لیں گے۔ آئندہ سال اکتوبر کے مہینہ تک انتظامی اصطلاحات کی ایک ڈکشنری ہندی اور پنجابی دونوں زبانوں میں چھاپ دی جائے گی اور افسروں کو دے دی جائے گی۔

اُردو کی بین اقوامیت

اُردو	تُو
لاطینی	تو
روسی	تی
فرانسیسی	تو
فارسی	تو
اطالوی	تُو
بنگلہ	توئی
ہسپانوی	تُو
جرمنی	دو

(اقبال کرشن)

بڑی بات

شہاب

ہاں ، نئی بات نہیں
روز لڑا کرتے ہیں
ایک ہی دودھ کے پالے بچے
ایک ہی کوکھ میں کھیلے ہوئے لال
ایک ہی گھر کے چھتر چھاؤں میں بسنے والے
ایک پریوار کے لوگ ——
ہاں ، مگر یہ تو نئی بات ہوئی ۔
ایک ہی دیس کے نوخیز سپوت ،
اک سمے سُوتر کا دامن پکڑے ،
"ایک مٹی کا لہو چوس کے ہوتے ہیں جواں"
ایک آکاش تلے ،
ایک ہی دھرتی کے بیٹے ——
اک وطن ،
ایک ہی سُکھ دُکھ کا چلن ،
ایک گن گیان سے تن من روشن ،
راستہ ایک ، بھوشیہ ایک ہے ، آدرش بھی ایک ،
ایک ہی سمت اُٹھاتے ہیں قدم ،
پھر بھی شطرنج کے مہروں کی طرح
اپنی ہی چال سے پٹ جاتے ہیں "
لڑکھڑاتے ہوئے شیشے جیسے ،
جب گلے ملتے ہیں ٹکراتے ہیں ،
اور ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں ——
پھر بڑی بات یہ ہے ،
انگلیاں کل جو کسی گھاؤ پہ مرہم دھرتیں ،
آج اپنوں پہ ترس کھا نہ سکیں ——
آنکھیں ، اب جن کو فضاؤں میں سفر کرنا تھا ،
بے گناہوں کو نہ پہچان سکیں ——
ذہن جو چاند ستاروں کا بدل بن سکتا ،
اس نے گل کر دئے اپنے ہی چراغ ——
وہی گنگ بل جسے بھارت کا بھرم رکھنا ہے ،
گھور سنگٹ جو پڑے اکھیت رہا ،
اس سے رکشا نہ ہوئی ۔
ہاں بہت کشتی رہی ،
بہنوں کی بھتی بستی ۔
کیا لٹا ؟
کون مرا ؟
آبرو کس کی رہی ، کس کی گئی ؟"
یہ نئی بات نہیں ،
کتنی بڑی بات ہوئی ! ——

—— • ——

چاند کی سوغات

کاوش بدری

زرد رو چاند گھٹاؤں کے تموج میں اسیر
اپنے ماتھے پہ لئے کاکل پیچاں کی شکن
دیر سے سوچ میں ہے
اک تصور کی طرح ، ایک منحنی کی طرح
زیر لب بادۂ گلگوں تمنا کا خروش
چشم پُر آب میں یخ بستہ خیالات کی لو
دور آفاق میں بکھرے ہیں منور آنسو
چور ہیں دست گہربار کے کنگن جو سو
گویا پگھلے ہوئے احساس کے انگارے ہوں
گویا دامان افق زار میں غم کی کلیاں !

—— • ——

چاندنی زرد غلاؤں کی تہوں میں گم سم
اپنی رخشندہ صباحت کو چھپائے
دیر سے سوچ میں ہے
رات آئینہ بکف دیر سے حیراں حیراں
محو نظارہ ہے اس بزم میں کب کیا ہوگا !

—— • ——

چند دھلکے ہوئے بادل کے حسیں گوشوں سے
ایک نغمہ کی کرن دیر سے دھندلائی ہوئی
جھیل کی سمت رواں ہے کوئی آہٹ کے بغیر
چند بیتے ہوئے لمحات کا ارمان لئے

—— • ——

شاخساروں میں مہکتی ہوئی کلیوں کی قطار
جھیل کی سطح کو گل ریز کئے
اس کرن کو رگ پنہاں میں بسا لیتی ہے
کسی نادیدہ حسینہ کے لئے !!!

ایک نظم

عادل منصوری

پھر آنکھوں میں کوئی
صورت گھوم رہی ہے
پھر زلفوں کی خوشبو
دل کو چوم رہی ہے
امیدوں کی کلیاں
ہیں مہکی مہکی
پھر یادوں نے چھیڑیں
باتیں بہکی بہکی
مرجانے کی حسرت
تھر تھر کانپ رہی ہے
پھر جینے کی خواہش
دل میں جاگ اٹھی ہے

—— • ——

حسن عسکری بلکھنوی

اُردو اور ایکتا

انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریز کی سامراجی خود غرضی نے مغل تمدن میں ہونے والے رواداری اور انسانیت کے تجربے کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے جو طریقے ایجاد کئے ان سے ہندوستان کو تہذیبی اعتبار سے جو نقصان پہنچا اس کو پورا کر کے آگے بڑھنے کا مسئلہ آج کے تاریخ بنانے والوں کے لئے ایک اہم مسئلہ ہے۔ مغل تمدن میں ہونے والے تہذیبی تجربے کی اہمیت اس بات سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہے کہ رویندر ناتھ ٹھاکر کے بزرگ مغلوں کے درباری تھے۔ مغلوں کے درباری ماحول میں مغل امارت کی رواداری کا جو نقشہ تھا اس کے اثرات مغلوں کے زوال کے بعد بھی اس خاندان پر اس کی ذہنی آزادی کی صورت میں باقی رہے۔

انگریز کے بنگال پر قابض ہونے کے بعد اسی ذہنی آزادی سے اس خاندان نے انگریز کو بہت تیزی سے متاثر کیا، اور اس کے بعد عالمی سطح پر ایک بڑا تہذیبی لین دین شروع کیا۔ اسی سلسلے میں رویندر ناتھ ٹھاکر جب روس گئے تھے تو وہاں کے کسانوں نے ان سے سوال کیا تھا:-

"آج کل ہندوستانی سیاست کی کیا حالت ہے اور وہاں ہندو مسلمانوں کے جھگڑے کیوں ہوا کرتے ہیں؟"

اس کا جواب رویندر ناتھ ٹھاکر نے یہ دیا تھا۔

"ہندو مسلمان ٹکراؤ ہندوستان میں صرف گزرے ہوئے پچیس برسوں سے دکھائی دے رہا ہے اس سے پہلے جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں اس طرح کی کوئی چیز نہ تھی پھر بھی ہندو مسلم بیر بھاؤ ہندوستان کے گاؤوں میں نہیں دکھائی دیتا۔"

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جس وقت رویندر ناتھ نے روس کا یہ سفر کیا اس وقت رویندر ناتھ کی عمر ۶۹ سال کی تھی وہ ادب کی ایک بڑی تخلیق کر چکے تھے لہٰذا انھوں نے جو یہ جواب دیا تھا وہ ایک سیاست داں کی حیثیت سے نہیں دیا تھا۔ ایک حقیقت پسند ادیب و شاعر کی حیثیت سے دیا تھا۔ انھوں نے روس میں ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ ٹکراؤ کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ پچیس سال سے دکھائی دے رہا ہے۔ رویندر کی اس رائے سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہوتی ہے کہ مغل تمدن میں جو رواداری کا تجربہ ہوا اس کے اچھے اثرات انگریزی دور میں بھی اس وقت تک باقی رہے جب تک انگریز کو اپنی سامراجی مصلحتوں کی خاطر ان اثرات کو کم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

رویندر کی ادبی میدان میں اترنے کی عمر کو دیکھتے ہوئے ان کی ہوشمندی کی عمر ۹۰ سال میں سے ۱۵ سال گھٹانے کے بعد ۴۵ سال کی ہوتی ہے۔ ان ۴۵ سال کے پہلے تقریباً تیس برسوں میں اور بعد کے پچیس برسوں میں انھوں نے جو فرق دیکھا اس کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا۔ انھوں نے روسی کسانوں کی معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ انگریز کی سامراجی مصلحتوں کا دباؤ شہروں پر زیادہ ہونے کے باعث شہروں میں جھگڑے زیادہ ہوتے ہیں مگر دیہات رواداری کی پرانی روایات کے اثر میں ہونے کے باعث ان جھگڑوں سے محفوظ ہیں۔ رویندر ناتھ ٹھاکر کے ان رجحانات کی تائید میں مغل تمدن کی روایات رواداری کو دیکھنے کے لئے ابوالفضل، فیضی، عرفی اور بیدل کے بڑے کارناموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی بڑی بحث نہیں چھیڑنی ہے۔ ایام زوال میں پیدا ہونے والے میر و غالب نے ہی اُردو کے ذریعہ سے پورے ہندوستان کو جو پیغام رواداری دیا اس میں ہی تہذیبی خدمت کا ایک بڑا افسانہ چھپا ہوا ہے اس سلسلے میں میر کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:-

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد • دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

اس شعر میں دل کی عالمگیریت ملاحظہ ہو، میر دل کے ڈھائے جانے سے کس قدر فکرمند ہے اس سلسلے میں اسے کعبہ بنانے کی نیکی کا بڑا روایتی تصور مطمئن نہیں کرتا ہے وہ شیخ و برہمن کے مذہبی رجحانات کی تبلیغ کے تہذیبی معیار سے مطمئن نہ ہو کر کہتا ہے:-

شرکت شیخ و برہمن سے میر • کعبہ و دیر سے بھی جائے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد • کسی ویرانے میں بنائے گا

میر کے یہاں بڑی سے بڑی نیکی کسی دل کو ٹھیس نہ پہنچانا ہے اپنے اس مسلک کو میر نے طرح طرح سے واضح کیا ہے اور اس سلسلے میں اپنے لہجہ کو اس نے ایسا بنانے کی کوشش کی ہے جس سے پتھر بھی پگھل جائیں مثلاً

کہتا ہے کون تجھ کو یہاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے جو پیارے دل میں بھی ٹک جا کر

کوئی ایسا گناہ اور نہیں • یہ کہ کیجے ستم کسی پر یار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے • ایک ہر گز نہ دیجیو آزار
یہی درخواست پاس دل کی ہے • نہیں روزہ نماز کچھ درکار

اس افسانۂ آدمیت کی کیا قیمت لگائی جائے؟ میر نے اس سلسلے میں ہر جگہ نرمی کو ہی نہیں اپنایا۔ اس نے اپنے مسلک کو زوردار الفاظ میں بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے:-

گوش کو ہوش کی ٹک کھول کے سن شورِ جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اس میں در آ
عالم آئینہ کے مانند در باز ہے ایک

ہندوستانی ماحول میں تہذیبی ترقی کی زبردست آرزو کو لے کر اس عالمگیر افسانۂ رواداری کی تخلیق ہوتی تھی، کیا ان روایات کی صحت آج کے حالات میں ہمیں کوئی سہارا نہیں دیتی ہے؟ اب ذرا غالب کا افسانۂ عقل ملاحظہ ہو۔ غالب ایک زبردست عقل پرست

فنکار تھا اس کی عقل پرستی کے اشاروں سے جو ذہنی آزادی کا تصور وابستہ ہے اس کے ذریعہ سے غالب اپنے فنکارانہ انداز میں اپنے بعد میں آنے والے ہندوستان کے سامنے عقلی آسودگی کا پرشکوہ نقشہ پیش کر رہا ہے:۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ● آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب آدمی کو تہذیبی اعتبار سے اتنا بلند دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے عقل پرست ذہن کے معیاری انسان سے اس کا ماحول خالی تھا اس کے نزدیک تہذیب و شائستگی کی ترقی عقل پرستی پر موقوف تھی لہٰذا وہ آدمی کو عقل پرستی کی طرف مائل کرنے کے لئے کہتا ہے:۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

تہذیب و تمدن کی آرائش کے لئے عقل کی جدت پسندی کو اکسانا اور رسم پرستی کی فرسودگی سے نفرت کرنا اس کا مسلک تھا لہٰذا اس نے اپنے اس مسلکِ عقل کی تہذیبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا تھا:۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

وہ یہ کہتا ہے کہ آدمی کے انفرادی و اجتماعی مسائل کو غور سے دیکھا جائے تو ذہن میں خیالات کا ایک حشر برپا ہو جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن کا یہ بڑا پھیلاؤ سینکڑوں سوالات لے کر ہر دور میں آدمی کے سامنے آتا رہا ہے اس سلسلہ میں ایک سوال سے سینکڑوں سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر سوچنے والے ہر وقت اور ہر جگہ سوچتے رہتے ہیں۔ غالب نے اپنی ذہنی آزادی کو اپنی فنکارانہ ذہانت سے کس طرح سے سجا کر پیش کیا ہے مثلاً:۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا ● واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

وہ ایک ہی قسم کی آرزوؤں اور تمناؤں کے بار بار دہرائے جانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اس میں اسے جمود کا پہلو نظر آتا ہے۔ لہٰذا اسی بنیاد پر دیر و حرم کو وہ تکرارِ تمنا کا آئینہ بتلاتا ہے یعنی ان دونوں کی روایتی اہمیت سے وہ مرعوب نہیں ہے اس کا ضمیر جس قدر جدتِ تمنا کا احترام کرتا ہے اتنا روایت پرستی کا احترام نہیں کرتا اس سلسلے میں اس نے دوسرے مصرعہ میں قوموں اور خاندانوں کے زوال کا یہ فلسفہ بیان کر دیا ہے کہ شوق کی شکستگی مختلف قسم کی پناہ گاہیں تلاش کرتی ہے۔

غالب کی زندگی میں اس کے ان ترقی پسند رجحانات پر مغل تمدن کے زوال نے پوری طرح غور نہیں کرنے دیا مگر آج کے حالات میں بھی ان رجحانات کو ٹھکرائے جانے کے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ یعنی ۷ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ہندی "ہندوستان" نے ایکتا اور اردو کے متعلق تشویش پیش کرتے ہوئے کہا ہے:۔

"بھارتی سنگم کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مرکزی بجلی وزیر حافظ محمد ابراہیم نے اردو کو ترقی کا موقع دینے کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے اگر ہم نے اردو کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تو وہ دیش کی فکری ایکتا میں مددگار ہو سکے گی۔ بھارتی سنگم کے خاص مہتمم سیٹھ گوبند داس نے یہ کہہ کر مانو انھیں مطمئن کرنے کی ہی کوشش کی ہے کہ:۔

(۱) بھارتی سنگم کا قیام فکری ایکتا کو مضبوط کرنے کے لئے ہی ہوا ہے اور

(۲) دیس کی تمام زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر راشٹریہ ایکتا کی بنیاد مضبوط کر کے اس دیس کی ایکتا کو مضبوط کر دینا چاہتے ہیں۔"

ان رجحانات پر ہندی "ہندوستان" کی تنقید ملاحظہ ہو:۔

"ہم اس کوشش کی کامیابی چاہتے ہیں مگر اردو کو بھارت کی فکری ایکتا میں سہایک ہونا ہے تو اسے اپنا ظاہر اور باطن بھارتی کرنا پڑے گا ودیشی فارسی اور عربی کے اپنے روپ کو چھوڑ اسے دیوناگری لپی اختیار کرنی چاہئے اور تشبیہوں وغیرہ کے لئے ایران یا عرب کی طرف آنکھیں کرنے کے بجائے دیس کی چیزوں کو ہی اپنانا چاہئے ایسا نہ کیا گیا تو لاکھ کوششوں اور وعدوں کے باوجود اس کی ترقی محدود ہی رہے گی اور ایکتا کا مقصد وہ شاید ہی ثابت کر سکے گی۔"

حافظ ابراہیم صاحب نے جو یہ رجحان پیش کیا ہے کہ "اردو کو آگے بڑھنے کا موقع دیا تو وہ دیس کی فکری ایکتا میں مددگار ہو سکے گی" اس کا بوجھ اٹھانا ہندی "ہندوستان" کے ایڈیٹر صاحب کی بیسویں صدی کی ذہنی آزادی کے لئے دشوار ہو گیا ہے اور اردو کی ترقی کے تصور سے یہ ہندی کو کہیں نقصان نہ پہنچے۔ اس خوف نے ان کی تنقید میں علمی اور عقلی اعتبار سے تہذیبی ترقی کے امکانات کو روشن کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہونے دی اردو کے دو بڑے فنکار جن کا ہندوستان کے عقل پرستوں پر اب بھی بڑا اثر ہے ان کے کارناموں کو دیکھ کر تو یہ کہا نہیں جا سکتا ہے کہ اردو نے دیس کی فکری ایکتا میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہے۔ ان دونوں فنکاروں نے عقل اور رواداری کے افسانہ کو جس تہذیبی نقطہ تک پہنچایا ہے اس نقطہ سے اونچا اٹھنے کا دعویٰ کرنا آج کی صحافت اور ادب کے لئے زیادہ آسان نہیں ہے۔

ہندی ہندوستان کے ایڈیٹر صاحب نے سیٹھ گوبند داس جی کے ان رجحانات کو پیش کیا ہے جو انھوں نے حافظ جی کی تقریر کے جواب میں پیش کئے ہیں۔ یہ رجحانات بھارتی سنگم کے قیام سے دیس کی فکری ایکتا کے مقصد کا لگاؤ ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایڈیٹر صاحب نے خوف اور احساس برتری کو اپنے صحافتی اسلوب بیان میں گھول کر جو پیش کیا ہے اس کو دیس کی فکری ایکتا یا تہذیبی ترقی کے اعتبار سے پرکھنا ضروری ہے۔

ایڈیٹر صاحب کی شرطیں ملاحظہ ہوں:۔ "اردو کو بھارت کی ایکتا میں سہایک ہونا ہے تو اسے اپنا ظاہر اور باطن بھارتی کرنا پڑے گا۔ ودیشی فارسی اور عربی کے اپنے روپ کو چھوڑ کر اسے دیوناگری لپی اختیار کرنی چاہئے اور تشبیہوں وغیرہ کے لئے ایران یا عرب کی طرف آنکھیں کرنے کے بجائے دیس کی چیزوں کو ہی اپنانا چاہئے۔"

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو کو آج ہندوستان کی ایکتا میں پہلی بار شامل ہونا ہے لہٰذا اسے اپنے بدیسی پن کو چھوڑ دینا چاہئے۔ (باقی صفحہ ۹ - کالم ۲)

انجمن کا خبرنامہ

پٹنہ یونیورسٹی کے حالیہ فیصلے کے خلاف ڈالٹن گنج میں احتجاجی جلسہ

جی، ایل، اے کالج ڈالٹن گنج (بہار) کے غیر ہندی طلبہ اور ان کے سرپرستوں اور خیر خواہوں کا ایک احتجاجی جلسہ زیر صدارت جناب ایم۔ ایل، کرد (وکیل) ۲۳ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہوا جس میں پٹنہ یونیورسٹی کے اس غیر آئینی، غیر جمہوری، دردناک اور قابل افسوس فیصلہ پر کہ طلبہ تمام غیر لسانی امتحان کے پرچوں کے جوابات ہندی میں دیں، احتجاج کیا گیا اور یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بلا کسی شرط کے واپس لیں اور صدر جمہوریہ ہند، وزیر اعظم، مرکزی وزیر تعلیم، چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، وزیر تعلیم بہار، لسانی اقلیتوں کے کمشنر اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیرمین کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے اس فیصلے سے جمہوریہ ہند کے آئین کی اس دفعہ کی توہین ہوتی ہے جس کی رو سے ہندوستان کے ہر شہری کو اپنی مادری زبان بولنے، لکھنے اور پڑھنے کا حق حاصل ہے۔ (نامہ نگار)

سہسرام اردو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا احتجاجی جلسہ

سہسرام کے شہریوں کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب خورشید صاحب منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل تجاویز بالاتفاق منظور کی گئیں۔

۱۔ یہ جلسہ پٹنہ یونیورسٹی کے اس فیصلہ کو جس میں تمام طلبہ کے لئے امتحانات کے جوابات ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھنا لازم قرار دیا گیا ہے، تشویش کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ یونیورسٹی کا فیصلہ لسانی اقلیت کے طلبہ کے مستقبل پر اثر انداز ہوگا اور ان کے مستقبل کی تعمیر میں رکاوٹ ثابت ہوگا طلبہ اب تک امتحانات کے جواب اپنی مادری زبان میں لکھتے آئے ہیں۔ ان کا یہ حق قائم رہنا چاہئے۔

اس لئے یہ جلسہ ذمہ دار اصحاب سے اپیل کرتا ہے کہ یہ فیصلہ غیر مشروط طور پر واپس لے لیا جائے کہ لسانی اقلیت کے طلبہ کی حق رسی ہو اور ان کو اجازت ہو کہ جوابات اپنی مادری زبان میں لکھیں۔

۲۔ ہائر سکنڈری اسکول میں ششماہی اور سالانہ امتحانات کے سوالات غیر لسانی مضامین میں صرف ہندی زبان میں چھپتے ہیں جس سے اردو داں طلبہ کو سوالات کے سمجھنے میں کافی زحمت ہوتی ہے اور کافی تیاری کے باوجود صرف سوالات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انھیں کم نمبر ملتے ہیں۔

باوجودیکہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۶۰ء اور ۸ر جنوری ۱۹۶۱ء کے جلسوں میں اس کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ سوالات اردو میں چھاپے جائیں۔ اور یہ کہ دو سو طلبہ کے دستخط سے ایک میموریل ڈی۔پی۔آئی کو روانہ کیا گیا۔ مگر ہنوز اردو داں طلبہ کا یہ جائز اور جمہوری مطالبہ منظور نہ کیا گیا۔

یہ جلسہ ذمہ دار حضرات کے اس غیر ہمدردانہ رویہ پر اظہار افسوس کرتا ہے اور اس مطالبہ کا اعادہ کرتا ہے کہ ہائر سکنڈری اسکول کے امتحانات کے سوالات اردو زبان میں بھی چھاپے جائیں۔ (مظہر علی۔ جنرل سکریٹری)

امجد حیدر آبادی کا یوم پیدائش

حیدر آباد۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۱ء مطابق ۷ر رجب ۱۳۸۱ھ

"امجد اکاڈمی" کے زیر اہتمام بیرون دبیر پورہ مسجد میر بادشاہ میں شام کے ۵ بجے امجد کا ۷۶ سالہ یوم پیدائش منایا گیا صدارت پروفیسر عبد القادر سروری نے کی۔

جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مولانا اکرام اللہ صاحب محدث نے امجد کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب رشید نے حیات امجد پر تقریر کی۔ عبد السلام زکی نے نظم سنائی۔ وقفہ وقفہ سے کلام امجد سنایا جاتا رہا۔ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کی نظم "یاد امجد" محمد عمر یوسفی معتمد اکاڈمی نے سنائی۔ صدر نے امجد کی شاعری اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں یہ تجویز ہوئی ہے کہ امجد کی یادگار کے طور پر ایک میوزیم قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ تصانیف کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا جائے۔ (محمد عمر یوسفی۔ معتمد)

بزم ادب کوٹہ (راجستھان) جناب اعجاز صدیقی مدیر رسالہ شاعر بمبئی کی تشریف آوری پر موصوف کے اعزاز میں بزم ادب کوٹہ کی جانب سے جناب وکیل محمد حسین ایڈوکیٹ کے دفتر میں ایک نشست منعقد ہوئی، جس میں مقامی شعراء، لطیف کوٹوی۔ ڈم ڈم کوٹوی، امین عمر اعظم، راہی بیکانیری، ساحر جودھپوری، قمر ٹونکی، لطفی کوٹوی، فروغ ٹونکی، ظفر پرواز، ماسٹر ظہیر غوری، مفتوں کوٹوی، فیاض صدیقی فتحپوری، شاد کوٹوی نے شرکت کی۔ صدارت جناب چاند مظفر نگری صدر بزم نے فرمائی۔ معزز مہمان نے دو تین مرتبہ اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ (مفتوں کوٹوی۔ جنرل سکریٹری)

ضلع میدک میں اُردو کا موقف اور مسائل

سدی پیٹ ۱۹ر دسمبر۔ شہریان سدی پیٹ کی جانب سے اُردو کانفرنس آندھراپردیش کے انعقاد کا خیر مقدم کرنے کے لیے ایک جلسۂ عام ۱۹ر دسمبر کی شام میں پبلک کلب سدی پیٹ میں منعقد کیا گیا جلسۂ عام کی صدارت جناب گروا ریڈی ایم۔ایل۔سی نے کی۔ جناب انور ادیب نے ایک قرارداد پیش کی جس میں ضلع میدک میں خاص طور پر محکمۂ تعلیمات میں اردو زبان کے متعلق سے بے تعلقی برتنے کی مذمت کی گئی اور بتایا گیا کہ۔۔ فوقانی مدارس میں ضلع میدک کے طلبہ کے نتائج جو اردو ذریعۂ تعلیم سے شریک ہے انتہائی خراب ہے یا بڑے بڑے قصبوں اور تعلقوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اساتذہ کو مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ تعلقہ نارائن کھیڑ کی گیارہویں جماعت کے لئے اب تک اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتذہ کا انتظام نہیں ہوا۔ جلسۂ عام نے پرزور مطالبہ کیا کہ مدرسہ فوقانیہ سدی پیٹ وکالج، دیگر مدارس اور دفاتر میں اردو زبان کے بورڈ بھی لگائے جائیں ایک اور قرارداد کے ذریعہ محکمۂ تعمیرات ضلع میدک کو سپارکباد دی گئی کہ اس نے تمثیل دانی و میز کے سنگ میلوں پر انگریزی، تلگو کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی فاصلہ کا اندراج کیا ہے۔ جلسۂ عام کو مخاطب کرتے ہوئے جناب بلارینڈی تمیتی پریسیڈنٹ سدی پیٹ نے کہا کہ کوئی بھی زبان قانون یا کسی فرد یا جماعت کی مخالفت سے ختم نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا کہ اُردو ہندوستانیوں کا مقدس ورثہ ہے جس کی پروان و ترقی کے لئے کوشش کرنا ان کا فرض ہے۔

جناب رشوا نادھم ایڈوکیٹ نے مطالبہ کیا کہ حکومت تمام محکمہ جات کو ایک قانون کے ذریعہ پابند کرے کہ اردو کے ساتھ ناانصافی کی صورت میں سرزنش کی جائے گی۔ جناب مجید خادم پرنسپل گاندھی کالج نے سنسکرت کے ایک شلوک سے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے تفصیلی روشنی ڈالی۔ جناب انور ادیب نے میدک ضلع میں اُردو کے ساتھ برتی جانے والی بے اتفاقی پر مفصل روشنی ڈالی۔ (ایک نامہ نگار)

انجمن نوجوان مصنفین بمبئی کی ادبی نشست

انجمن نوجوان مصنفین کی پندرہ روزہ ادبی نشست، دفتر "نوجوان پارٹی" (تیسری کھیلا بھائی اسٹریٹ، مدنپورہ) میں منعقد ہوئی۔ صدارت حسن جعفری صاحب نے فرمائی۔

سب سے پہلے جوائنٹ سکریٹری نے گزشتہ میٹنگ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو مناسب ترمیموں کے بعد منظور ہوگئی۔ اس کے بعد مقبول عالم نے افسانہ "روپے" اور محمد بشیر، عبدالرشید، کوثر، ستار خیفی، جسونت سنگھ، عزیز جاوید اور حسن جعفری نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں۔

تخلیقات پر کی گئی بحث میں انیس جلالی، حمید سروری، رحمن کلامی، جسونت سنگھ، حسن جعفری، مقبول عالم اور سلیمان ظفر نے حصہ لیا۔

(سلیمان ظفر۔ جوائنٹ سکریٹری)

بقیہ

اُردو اور ایکتا

اس طرح اردو والوں کو کمتری کا احساس دلایا جارہا ہے، مگر اس احساس پر ... ڈالا گیا جائے جن کا سنسکرت سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ سنسکرت بھی تو ایک ودیشی زبان ہے، اس کا پورا پرکاش دہلی، الہ آباد، بنارس، اجین اور ہندو شہروں میں نہیں ہوا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سنسکرت ودیشی فارسی کی اسی طرح بہن ہے جس طرح ہندی اُردو کی۔ اس کا ثبوت سنسکرت اور فارسی دونوں بہت سے ملتے جلتے الفاظ کے ذریعہ سے خود پیش کرتی ہیں۔ مثلاً

سنسکرت	اردو	سنسکرت	فارسی
ہستا	دست	نوبت	لب
پرشٹھ	پُشت	ستھان	ستان
پتر	پدر	انگشٹ	انگشت
اشو	اسپ	گرنتھ	گرہ
دنت	دنداں	ماتر	مادر
اشٹ	ہشت	ہیش	عیش

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سنسکرت کا کل سرمایہ ہندوستان کی ہی پیداوار نہیں ہے مثلاً آچاریہ پاننی کا ویاکرن جو سنسکرت کا سب سے اچھا ویاکرن ہے ان کی پیدائش قندھار کے گرد و نواح میں ہوئی تھی اور انھوں نے ٹکشلا میں تعلیم پائی تھی۔ دونوں مقام آج کے حالات میں بدیشی ہیں۔ اس اعتبار سے پاننی کا تمام کارنامہ بدیسی ہوا؟ اس بدیسی پن کو تو وقت کی بڑی لمبائی نے بھلا دیا مگر دہلی، آگرہ اور لکھنؤ کی گلیوں میں پیدا ہونے والی اُردو میں ہندی کی غیر صحت مند محبت بدیسی پن بڑی آسانی سے تلاش کر لیتی ہے۔

ہندوستان میں دو تہذیبوں کے ملنے کے باعث پیدا ہونے والے سوالات کو حل کرنے کے لئے عوامی بے تکلفی نے اُردو کو جنم دیا۔ اُردو اس بے تکلفی کو ایک عرصہ تک اپنائے رہی مگر ایک دور میں وہ فارسی اور عربی کے عالمانہ اثر میں بھی ضرور آئی۔ لیکن اب وہ عوامی زندگی کے بڑے دائرے میں اپنی صحت کا نقشہ بنانے کی طرف مائل ہے۔

انگریزوں نے اپنی سامراجی خود غرضی کے جیب رہنماؤں کے ذریعہ سے ہندوستان کی ذہنی آزادی کی ترقی کی رفتار پر جو اثر ڈالا اس کے باعث نہرو و غالب کے ذہنی آزادی کے بڑے کارنامے کو اس طرح نہیں دیکھا جاتا ہے جس طرح دیکھا جانا چاہئے تھا۔ اسی بنا پر آج کے ہندوستان کے فکری ایکتا کے کام میں اردو کی شرکت کی اہمیت اُردو کی ذہنی آزادی کی قابل قدر نمائندگی کی روشنی میں نہیں دیکھی جا رہی ہے۔

بقیہ

بابائے اُردو کا رسالہ افسر

اور پڑھنے والے کو اس مضمون پر ایک عبور سا ہو جاتا ہے اور جی ذرا نہیں اکتاتا۔ اور اس پر زبان کی فصاحت اور سلاست اور زورِ بیان ایسا ہے جیسے سونے پر سہاگہ۔ مولانا حالی کے طرزِ بیان میں ایک خاص بات ہے جس پر عام طور پر نظر نہیں پڑتی، اسے میں "استادانہ ضبط" سے تعبیر کرتا ہوں جس سے میرا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس قدر بات کو پھیلاتے ہیں کہ مضمون پھس پھسا اور پھیکا ہو کے رہ جائے اور طول ناگوار نہ گزرے اور نہ اس قدر مختصر کہ ادھورا اور ناقص معلوم ہو بلکہ نہایت اعتدال کے ساتھ اپنے مضمون کو اس خوبی اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔ مگر پھر ضبط اس قدر ہے کہ اس کا پھیلاؤ اعتدال سے بڑھنے نہیں پاتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سرسید کی لائف باوجود اس قدر مواد کے اس خوبی کے ساتھ اتنی ضخامت میں نہ آسکتی۔ اور باوجود اس کے تحقیق و تنقید کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہمارے موجودہ مصنفین میں صرف مولانا حالی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن میں کرٹی سزم (تنقید) کی قوت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا حالی سرسید کے سچے قدردان اور بہت بڑے مداح ہیں مگر ان کی لائف میں انھوں نے انصاف کو مدِنظر رکھا ہے۔ نہ بے جا طرفداری کی ہے اور نہ بے جا بدگمانی ہے۔ جہاں انھوں نے غلطی کی ہے اسے صاف ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن جہاں خوبیاں اس کثرت سے ہوں کہ عیب اس کے مقابلے میں ایسے ہوں جیسے پہاڑ کے سامنے رائی کا دانہ، تو وہاں سوائے اس کے کہ خوبیوں کی تعریف اور اسکی مدح سرائی کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کے احسانات ہماری قوم پر اس قدر ہیں کہ اس کا حق کبھی ادا نہیں ہو سکتا اور اس بڑا کا احسان۔ غرض ہر پہلو پر اس خوبی سے بحث کی ہے اور سرسید کے منشا اور غایت کو اس عمدگی سے بتایا ہے۔ کہ پڑھنے والا مولف کا ہم خیال ہو جاتا ہے، اور بہت سی بدگمانیاں جو حقیقی حالات معلوم ہونے سے دلوں میں راسخ ہو گئی تھیں وہ اس کتاب کے ایک بار پڑھنے سے جاتی رہتی ہیں خصوصاً سرسید کی مذہبی تصانیف اور مذہبی خیالات کے متعلق جو بحث لکھی ہے وہ قابل دید ہے جو لوگ سرسید کے مذہبی خیالات کے مخالف ہیں یا تھے، ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس زمانہ کی ہوا نہیں کھائی اور جنھوں نے اس صدی کے علوم و فنون کی حقیقت کو نہیں سمجھا، اور اس لئے وہ سرسید کے منشا کو نہ سمجھ سکے، ورنہ سرسید نے اگر کوئی بڑا کام کیا ہے تو وہ یہی ہے، اور جو کچھ ہے سب اس کے ضمن میں آگیا۔ وہ نوجوان جو انگریزی پڑھ پڑھ کر اپنے مذہب میں ڈانواں ڈول تھے ان کو بتایا کہ اگر دنیا میں کوئی سچا مذہب ہے تو وہ اسلام ہے اور انھیں اسلام پر قائم کیا۔ (باقی)



تبصرہ

خلیل الرحمٰن اعظمی

خیال پارے

مصنف : ڈاکٹر وزیر آغا
ناشر : اکادمی پنجاب۔ لاہور
قیمت : ڈیڑھ روپیہ

اردو نثر کے سرمائے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انشا پردازی اور انشا پرداز کی اصطلاحات نئی نہیں۔ ہر وہ نثر نگار جو اپنے خیالات یا تجربات عمومی اور کاروباری انداز سے ہٹ کر ایک ایسے پیرایے میں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں تخئیلی اور تخلیقی عناصر کے ساتھ ساتھ اس کا شخصی اسلوب اور انفرادی لب و لہجہ نمایاں طور پر محسوس ہو اور اس کی تحریر صرف ہمارے علم یا بصیرت میں ہی اضافہ نہ کرے بلکہ ہمارے لئے جمالیاتی مسرت کا سامان بھی فراہم کرے ہمارے یہاں انشا پرداز کہا جاتا ہے۔ ایسے ادیب کے خیالات یا اس کا نقطۂ نظر ہمارے لئے قابل قبول نہ ہو تو بھی اس کی تحریریں اپنے ادبی اور تخلیقی رنگ و آہنگ کی بدولت ہمارے لئے باعث توجہ ہوتی ہیں غالباً اسی وجہ سے مہدی افادی نے محمد حسین آزاد کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ایک ایسے نثر نگار ہیں جو اپنی انشا پردازی کے بل پر زندہ رہ سکتے ہیں انھیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ اس طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر "دربار اکبری" تاریخ کی ایک مستند کتاب نہ ہو تو بھی اپنی نثر کی بدولت زندہ رہے گی، اور "آب حیات" تنقید اور تذکرہ نگاری کی رو سے کیسی ہی ناقص ہو اس کے لکھنے والے کا اسلوب بذات خود اتنا جاندار ہے کہ یہ کتاب ہر زمانہ میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ تخلیقی نثر کے یہ نمونے ہمیں میر امن اور غالب سے لے کر حالی، شبلی، نذیر احمد، مہدی افادی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبد الغفار، ابو الکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، عبد الماجد دریابادی، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، فراق، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور بہت سے دوسرے ادیبوں کی تحریروں میں مل جائیں گے لیکن ان انشا پردازوں نے نثر کی جن اصناف کو برتا ہے وہ تاریخ، سوانح نگاری، تنقید یا علمی مقالات، فلسفیانہ اور شاعرانہ مضامین، مکتوب نگاری، طنز ظرافت، صحافتی مضامین یا افسانے اور خاکے وغیرہ ہیں، انگریزی ادب میں جس چیز کو ایسے (ESSAY) کہتے ہیں اور کبھی کبھی اس صنف ادبی کے تعین کے لئے لائٹ ایسے (LIGHT ESSAY) یا پرسنل ایسے (PERSONAL ESSAY) بھی کہا جاتا ہے اس کی طرف ہمارے یہاں کم توجہ کی گئی ہے۔ ہمارے انشا پرداز عام طور پر مؤرخ، سوانح نگار، مبلغ، مصلح، جمال پرست، ناقد، افسانہ نویس، طنز نگار اور مزاح نگار وغیرہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شخصی لہجے کے باوجود ESSAY نہیں ہو پاتے اور نہ ان کے مقالات یا مضامین کو ہم ESSAY کہہ سکتے ہیں۔ ایک باضابطہ کتاب کے مقابلے میں ایک مختصر تحریر کے لئے خواہ وہ علمی اور فلسفیانہ ہو یا تنقیدی اور مزاحیہ ہم اردو میں مقالہ یا مضمون کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اگر جمالیاتی اور تاثراتی عنصر زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے تو ایسی تحریر کو "انشائے لطیف" کہا جاتا ہے مگر ہمارے یہاں ایسے (ESSAY) کی صنف کا اس طرح تعین نہ ہو سکا جس طرح انگریزی یا بعض دوسری مغربی زبانوں میں ہے حالانکہ سجاد حیدر، خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے یہاں بعض ایسے مضامین مل جاتے ہیں جو ESSAY کی شرائط کو خاصی حد تک پورا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے ساتھ بعض دوسرے ادیبوں نے پچھلے چند برسوں میں ایسے مضامین لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ESSAY کو اب ایک علٰحدہ صنف کی حیثیت سے ہمارے یہاں برتنے کی شعوری کوشش کی جا رہی ہے، اور اس کے لئے ایک نئی اصطلاح "انشائیہ" کی وضع کی گئی ہے اور اس کے لکھنے والے کو "انشائیہ نگار" کہا جاتا ہے۔

"خیال پارے" آغا صاحب کے پچیس ۲۵ انشائیوں کا مجموعہ ہے اس مجموعہ کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے سنجیدگی کے ساتھ اس صنف کے خد و خال متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ صرف یہ کہ اس کے جاندار نمونے پیش کئے اور اس کے امکانات دریافت کئے ہیں بلکہ وہ اس کے بہت اچھے شناور اور پارکھ بھی ہیں چنانچہ "انشائیہ کیا ہے" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ اس مجموعے کے شروع میں درج ہے جس میں "انشائیہ" کی خصوصیات اور اس کے بنیادی عناصر کا تجزیہ کر کے اس صنف کے حدود کا تعین کیا گیا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس مضمون کے بعض اقتباسات پیش کر دئے جائیں :-

> "ایک چیز جو انشائیہ کو دوسری اصناف ادب سے میز کرتی ہے اس کا غیر رسمی طریق کار ہے۔ دراصل انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لئے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظر کے ذہن میں رد و قبول کے میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے۔ اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لئے زندگی کی سنجیدگی اور گہما گہمی سے قطع نظر کر کے ایک غیر رسمی طریق کار اختیار کرے اور اپنے شخصی رد عمل کے اظہار سے ناظر کو اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرے۔

> دوسرے لفظوں میں مقالہ یا انشائیہ کا خالق اس دفتر کی طرح ہے جو ہیبت اور رکھ رکھاؤ اس خصوصیت کے دفتری قواعد و ضوابط کے تحت اپنی کرسی پر بیٹھا حساب اور تجزیے کے تمام مراحل سے گزرتا ہے اور انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، ہیبت اور رکھ رکھاؤ کا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے

اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر اور حقّے کی نے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔"

"انشائیہ نگار غیر شخصی موضوعات پر نقدو تبصرے سے کام لینے کے بجائے اپنی روح کے کسی گوشے کو بے نقاب اور اپنے شخصی رد عمل کے کسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ انشائیہ کے خالق کے پاس کئی ایسی کہنے کی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ اس طور پر کہ آپ اس کے دائرۂ احباب میں شامل ہو جاتے اور اس کے دل تک رسائی پا لیتے ہیں۔"

"انشائیہ کی ایک اور امتیازی خصوصیت اسکی عدم تکمیل ہے۔ ایک مقالہ لکھتے وقت جہاں یہ ضروری ہے کہ موضوع زیر بحث کے تمام تر پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کیا جائے اور تحلیل، تجزیہ اور دلیل سے اپنے نقطۂ نظر کو اس انداز سے پیش کیا جائے کہ مقالہ ایک مکمل و اکمل صورت اختیار کرے وہاں انشائیہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موضوع کی مرکزیت تو قائم رہتی ہے لیکن اس مرکزیت کا سہارا لے کر بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ دی جاتی ہیں جس کا بظاہر موضوع سے کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ایک مقالے کی بہ نسبت انشائیہ کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا (LOOSE) ہوتا ہے اور اس میں مقالے کی سنگلاخی کیفیت موجود نہیں ہوتی۔"

"انشائیہ نثر کی دوسری اصناف سے اپنے اختصار کے باعث علیحدہ نظر آتا ہے۔ سانیٹ کی طرح انشائیہ کا بھی ایک مختصر سا میدان ہے جس کے اندر انشائیہ لکھنے والا آپ کو تصویر کا ایک مخصوص رُخ دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ جذبات و احساسات اور تخیلات میں کاٹ چھانٹ اور کفایت (ECONOMY) کا قائل نہ ہو اس کے لئے چند لفظوں میں موضوع کی سب سے دلکش کیفیت کو پیش کرنا مشکل ہوگا۔"

"ایک آخری چیز جسے انشائیہ کا امتیازی وصف سمجھنا چاہیے اس کی تازگی ہے۔ تازگی سے مراد موضوع اور نقطۂ نظر کا وہ انوکھا پن ہے جو ناظر کو زندگی کی یکسانیت اور ٹھہراؤ سے اوپر اٹھا کر ماحول کا از سر نو جائزہ لینے پر مائل کرتا ہے۔ عام طور پر ہم سب زندگی کے مظاہر کو ہر روز دیکھتے دیکھتے ان سے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان کے بہت سے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے۔ انشائیہ لکھنے والا زندگی کے عام مظاہر کے ان تازہ پہلوؤں کو دیکھ لیتا ہے جو زندگی میں سطحی دلچسپی کے باعث ایک عام انسان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔"

انشائیہ نگاری کی ان بنیادی شرائط کو وزیر آغا نے اپنے مضامین میں برتنے کی کوشش کی ہے اور موضوعات اور طرز نگارش دونوں اعتبار سے ان کے یہاں انشائیہ کی روح ملتی ہے بعض عنوانات ایسے ہیں کہ انھیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی نیا پہلو آ سکتا ہے۔ مثلاً آندھی، گرمی، بارش، ریل کا سفر، تنہائی، دھند، لحاف، رنگ، ناپنا، قطب مینار، خوبصورتی، بہادری، جھگڑا، ریلوے ٹائم ٹیبل، طلالت، بے ترتیبی، خاموشی، سست روی وغیرہ۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جو پیش پا افتادہ، پامال اور سامنے کے مناظر یا حقائق کی یاد دلاتے ہیں اور ان لفظوں کے ذہن میں آنے کے بعد عام طور پر تخیل یا تصور کے نئے در یچے نہیں کھلتے، اور نہ حقیقت کا کوئی نیا پہلو دکھائی دیتا ہے لیکن وزیر آغا کے ان مضامین کو جوں جوں پڑھتے جائیے، ان جانی بوجھی اور روزانہ کی دیکھی اور آزمائی ہوئی چیزوں کے بارے میں یہ احساس ہوگا جیسے ہم انھیں پہلی بار دیکھ رہے ہیں یا اس سے پہلے ہم نے انھیں اس زاویے سے کیوں نہ دیکھا۔ تازگی اور تازہ کاری کا یہ عنصر ان مضامین کا نمایاں وصف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مضمون عنوان سے اس قدر بندھا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کے دائرے میں دوسرے حقائق کی سمائی نہ ہو سکے بلکہ بعض معمولی باتوں کے سہارے آپ ان وادیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں زندگی کے تنوع، رنگا رنگی اور ایک شے کے دوسری شے سے ربط و تعلق کے بارے میں نئے نئے انکشافات سامنے آتے ہیں۔

وزیر آغا شاعر بھی ہیں اور ایک اچھے ناقد بھی۔ انھوں نے خوبصورت نظمیں بھی لکھی ہیں اور جدید نظم کو اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے سمجھنے سمجھانے کا کام بھی سلیقے سے کیا ہے۔ "اردو ادب میں طنز و مزاح" کا تفصیلی جائزہ لکھ کر انھوں نے تحقیق و تنقید کا اچھا امتزاج بھی پیش کیا ہے۔ لیکن "خیال پارے" ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں ان کی انفرادیت نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ان کی شاعری اور تنقید معرض بحث ہو سکتی ہے لیکن انشائیہ نگاری کے باب میں ان کی خدمات کا منکر شاید ہی کوئی ہو۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا